سماجی تعلقات

معاشرتی تعلقات کے ذیل میں کھانے، پینے اور لباس کا ذکر آچکا ہے۔ ان تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سماجی تعلقات کے تحت اس کے بعض اور پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

غیر مسلم کو سلام کرنا

احادیث میں سلام کو رواج دینے کا حکم ہے۔ زیادہ تر علماء کے نزدیک اس کا تعلق مسلمانوں سے ہے، اس لیے غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جاسکتا، لیکن بعض حضرات کے نزدیک سلام ایک طرح کی دعا ہے۔ یہ دعا غیر مسلم کو بھی دی جاسکتی ہے[1]

غیر مسلم کو دعا دینا

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی۔ اس نے وہ پیش کی تو آپ نے اسے دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمھیں حسین وجمیل رکھے، چناں چہ مرتے وقت تک اس کے بال سیاہ رہے[2]

علاّمہ بغوی اس روایت کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اہل کتاب کو دعا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ روایت میں آتا ہے کہ ایک

---

[1] اس مسئلہ پر مستقل بحث آگے آرہی ہے۔

[2] عبد الرزاق، المصنف: ۱۰/ ۳۹۲

یہودی نے رسول اللہ ﷺ کو دودھ دوہ کر پیش کیا۔ آپ نے اسے دعا دی کہ اللہ اسے حسین وجمیل بنا دے۔ چناں چہ اس کے بال سیاہ ہوگئے۔ وہ نوے برس کے قریب زندہ رہا، لیکن اس کے بالوں میں سفیدی نہیں آئی[1]

چھینک کی دعا کا جواب

کوئی شخص چھینکنے کے بعد الحمد للہ کہے تو حکم ہے کہ سننے والا 'یَرْحَمُکَ اللّٰہ' کہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ یہود آپ کی مجلس میں زبردستی چھینکتے تھے، تاکہ زبانِ مبارک سے ان کے حق میں یہ دعائیہ الفاظ ادا ہوں۔ آپ یرحمکم اللّٰہ کے الفاظ تو ان کے لیے استعمال نہیں فرماتے تھے، البتہ یھدیکم اللّٰہ و یصلح بالکم کہا کرتے تھے[2] یہ بھی دعا ہے اور اس کا مطلب ہے اللہ تمھیں ہدایت سے نوازے اور تمہارے حالات کو ٹھیک کردے۔

اس سے واضح ہے کہ غیر مسلم کو اس کے مناسب حال دعا دی جاسکتی ہے۔ یہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات اور نوعِ انسانی کے ساتھ اس کے شریفانہ رویہ کا فطری تقاضا ہے۔

غیر مسلم کا اکرام

حسنِ سلوک کا تعلق مالی مدد ہی سے نہیں، اخلاقی رویہ سے بھی ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کے ساتھ بات چیت میں، ملنے جلنے اور تعلقات میں اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ ہو۔ ان میں جو سماجی اور معاشرتی لحاظ سے جس حیثیت کا مالک ہو اس کے مطابق اسے عزت واحترام کا مقام دیا جائے۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق کی خدمت میں ایک ذمی پہنچا تو انھوں نے اس کی

---

[1] بغوی، شرح السنۃ: ۱۲/ ۲۷۳

[2] ابوداؤد، کتاب الادب، باب کیف یُشمّت الذمی۔ ترمذی، ابواب الاستیذان، باب کیف یشمت العاطس

تعظیم وتوقیر کی۔ حاضرین میں سے بعض نے اس پر ناگواری کا اظہار کیا تو قاضی اسماعیل نے سورہ ممتحنہ کی آیت ۸ کا حوالہ دیا[1]

مطلب یہ کہ قرآن مجید نے ذمیوں اور غیر محاربین کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کیا ہے۔ یہ احترام اسی حسنِ سلوک میں داخل ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ مسلمان کسی ذمی کے احترام میں کھڑا بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ علامہ عز الدین سلام نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ البتہ نہ کھڑا ہونے میں کسی بڑے ضرر کا خطرہ ہوتو فرماتے ہیں کہ کھڑا ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علماء احناف میں ابن وہبان اس کا ایک مثبت پہلو بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذمی کا اسلام کی طرف رجحان ہوتو قیام کی گنجائش ہے۔ بعض لوگوں نے ہر دینی مصلحت کو یہی حیثیت دی ہے[2]

اس قسم کے مسائل کو بالعموم اس سوال سے جوڑ دیا گیا ہے کہ مسلمان جب برسر اقتدار ہوں تو ان کا ذمیوں کے ساتھ، جو اقتدار میں شریک نہیں ہیں، کیا رویہ ہونا چاہیے، لیکن اگر اسے اسلام کی عام اخلاقی تعلیمات اور اپنوں اور غیروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیکی اور احسان کی ہدایات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس سے زیادہ وسیع پس منظر میں ان پر غور وفکر ہوسکتا ہے۔

غیر مسلم کو مہمان رکھنا

اس سے پہلے حضرت اسماءؓ کا واقعہ گزر چکا ہے کہ ان کی مشرک والدہ مکہ سے مدینہ ان کے گھر آئیں، کچھ تحفے بھی لائیں، ان سے انھیں توقعات بھی تھیں، حضرت اسماءؓ نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے انھیں اپنے گھر ٹھہرایا اور ان کی خدمت کی۔ اس حدیث کے ذیل میں علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

---

[1] ابن العربی مالکی، احکام القرآن: ۲/۲۵۰۔ اس آیت کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔

[2] آلوسی، روح المعانی، جزء ۲۸، ص ۲۵

فيه دليل علىٰ جواز قبول هدية المشرك كما دلت على ذٰلك الاَحاديث السالفة و علىٰ جواز انزاله منازل المسلمين[1]

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ مشرک کا ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ اس باب میں جو حدیثیں گزر چکی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے۔ اس حدیث میں اس امر کا جواز بھی موجود ہے کہ مشرک کو مسلمانوں کے گھروں میں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

غیر مسلم کی عیادت

سماجی تقاضوں میں ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی شخص بیمار ہو تو اس کی عیادت اور خبر گیری کی جائے اور اس سے محبت اور ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ اسلام نے مریض کی عیادت کی ترغیب دی ہے اور اسے بہت بڑا کارِ ثواب بتایا ہے۔[2]

احادیث سے غیر مسلم کی عیادت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بہ نفس نفیس غیر مسلم اشخاص کی عیادت کی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپ بنونجار کے ایک شخص کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ (اس دوران میں) اس سے کہا اے ماموں! آپ 'لاَ اِلٰهَ اِلّا اللّٰه' کا اقرار کیجیے۔ اس نے کہا کہ میں ماموں ہوں یا چچا؟ آپ نے فرمایا: نہیں، ماموں ہیں (اس لیے کہ آپ کی والدہ حضرت آمنہ کا تعلق مدینہ سے تھا) اس نے کہا کہ کیا لاَ الٰهَ الّا اللّٰه کا اقرار میرے حق میں بہتر ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔[3]

حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت

---

[1] شوکانی، نیل الاوطار: ۶/ ۱۰۷۔ غیر مسلم کو تحفے دینے کا ثبوت حضرت عمرؓ کے اس واقعہ سے بھی ملتا ہے جو اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ انھوں نے رشتہ کے ایک مشرک بھائی کو ایک چادر، جو رسول اللہ ﷺ نے انھیں دی تھی، تحفے میں بھیجی۔ اس موضوع پر مستقل بحث آگے آرہی ہے۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' ص ۳۶۵-۳۶۹

[3] مسند احمد: ۳/ ۱۵۲، ۱۵۴، ۲۶۸

کیا کرتا تھا۔ وہ بیمار ہوا تو آپ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کے سرہانے بیٹھے۔ اس سے کہا کہ تم اسلام لے آؤ۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، جو اس کے قریب ہی موجود تھا۔ اس نے کہا: ابو القاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات مان لو۔ چناں چہ وہ اسلام لے آیا۔ نبی ﷺ وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس بچہ کو جہنم سے بچا لیا[1]

ان روایات سے مشرکین اور یہود کی عیادت کا ثبوت ملتا ہے۔ اسلام کا پیش کرنا تو خیر خواہی کا تقاضا ہے۔ آدمی جسے حق سمجھے گا اسے وہ ہر حال میں پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔ فقہاء نے رسولِ اکرم ﷺ کے اس اسوہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ غیر مسلموں کی عیادت اور تعزیت جائز ہے، اس میں ازروئے شرع کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ کوئی غیر مسلم بیمار ہوجائے تو اس کے مسلمان رشتہ دار کو اس کی عیادت کرنی چاہیے:

ان كانت قرابة قريبة بين مسلم و كافر فليعد المسلم الكافر[2] اگر مسلمان اور کافر کے درمیان قریبی رشتہ داری ہے تو مسلمان کو کافر کی عیادت کرنی چاہیے۔

کسی سے قرابت اور رشتہ داری ہو تو اس کے حقوق زیادہ ہیں، لیکن یہ عیادت کے لیے شرط نہیں ہے۔ یہ ایک دینی، اخلاقی، بلکہ انسانی تقاضا ہے، جسے پورا ہونا چاہیے۔ سلیمان بن موسیٰ کہتے ہیں:

نعود بنى النصارىٰ و ان لم تكن بيننا و بينهم قرابة[3] ہم لوگ نصاریٰ کی اولاد کی عیادت کرتے ہیں، اگرچہ کہ ہمارے اور ان کے درمیان قرابت نہیں ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی فمات الخ۔ مصنف عبد الرزاق: ۶/ ۲۴ میں اسی مفہوم کی ایک روایت ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کا ایک یہودی پڑوسی تھا، جو اخلاقی طور پر برا نہ تھا۔ آپ نے اس کی عیادت کی۔ پھر اوپر ہی کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ ممکن ہے، یہ کوئی دوسرا واقعہ ہو۔

[2] عبد الرزاق، المصنف: ۶/ ۳۵ [3] حوالہ سابق: ۶/ ۳۶

فقہ حنفی میں عمومی انداز میں کہا گیا ہے:

و لاَ بأس بعيادة اليهودی و النصرانی لِانّه نوع برّ فی حقهم و ما نهينا عن ذٰلک[1]

یہودی اور نصرانی کی عیادت میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ یہ ان کے حق میں ایک طرح کی بھلائی اور حسن سلوک ہے۔ اس سے ہمیں منع نہیں کیا گیا ہے۔

درمختار میں ہے کہ 'اس بات پر اجماع ہے کہ ذمی کی عیادت جائز ہے'۔ مجوسی کی عیادت کو بھی صحیح قول کے مطابق جائز قرار دیا گیا ہے[2]

غیر مسلم کے جنازے کا احترام

حضرت سہل بن حنیفؓ اور قیس بن سعدؓ قادسیہ میں تھے۔ ایک جنازہ گزرا تو وہ کھڑے ہوگئے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ ذمی کا جنازہ تھا۔ انھوں نے جواب دیا: اسی طرح رسول اللہ ﷺ ایک جگہ تشریف فرما تھے۔ آپؐ کے سامنے سے جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہوگئے۔ عرض کیا گیا کہ یہ یہودی کا جنازہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا: کیا وہ نفس (جان) نہیں ہے؟ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: موت سے ایک گھبراہٹ ہوتی ہے (اس کا تعلق مسلم یا غیر مسلم سے نہیں ہے)[3]

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ کسی بھی انسان کی موت ایک الم ناک حادثہ ہے۔ اس سے مومن کو اپنی موت یاد آتی ہے اور وہ عبرت حاصل کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم تجہیز و تکفین اور اس نوع کے دیگر مذہبی مراسم آزادی سے انجام دے سکتے ہیں[4]

---

[1] ہدایہ: ۴/۴۷۲ [2] ردالمحتار علی الدر المختار: ۵/۳۴۱

[3] بخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنازۃ الیہودی۔ مسلم، کتاب الجنائز۔ باب القیام للجنازۃ

[4] علماء نے لکھا ہے کہ مسلمانوں اور ذمیوں کے طریقوں میں فرق ہونا چاہیے اور ان کی تجہیز و تکفین کے اوقات بھی مختلف ہونے چاہئیں۔ اس حدیث سے بعض علماء کے بقول ان اجتہادات کی تردید ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ و استدل بحدیث الباب علی جوازِ (باقی اگلے صفحہ پر)

غیر مسلم کی تجہیز و تکفین

کافر والدین یا عزیزوں کا انتقال ہوجائے تو مسلمان اولاد ضرورت پر ان کے کفن دفن کا نظم کرے گی۔ رسولِ اکرم ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب بیمار ہوئے تو آپ نے ان کی عیادت فرمائی[۱] جب انتقال ہوا تو حضرت علیؓ نے آپ کو اس کی اطلاع دی۔ یہ خبر سن کر آپ رو پڑے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ان کی مغفرت کی دعا بھی کرتے رہے، بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا تو رک گئے[۲]

حضرت علیؓ نے دریافت کیا کہ انھیں کون دفن کرے گا؟ آپ نے فرمایا: جاؤ اپنے باپ کو دفن کرو۔ پھر اور کوئی کام کیے بغیر سیدھے میرے پاس آؤ۔ میں گیا، انھیں دفن کیا[۳] اور آپ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے مجھے غسل کا حکم دیا اور دعا دی۔ ایسی دعا کہ اس کے عوض مجھے سرخ و سیاہ اونٹ (دنیا جہان کی دولت) بھی پسند نہیں[۴]

غیر مسلم کے غسل اور تدفین کو بعض فقہاء نے جائز قرار دیا ہے اور بعض نے صرف اس صورت میں اس کی اجازت دی ہے، جب کہ اس کی تدفین کا نظم نہ ہو۔

معمر کہتے ہیں کہ میرے ساتھ یہودی یا نصرانی ہو، اس کا انتقال ہوجائے اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اخراج جنائز اهل الذمة نهارا غير متميزة عن جنائز المسلمين۔ اشار الىٰ ذٰلک الزين بن المنير قال و الزامهم بمخالفة رسوم المسلمين وقع اجتهادًا من الائمة۔ فتح الباری: ۳/۱۸۱

[۱] مصنف عبد الرزاق: ۶/۳۶

[۲] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۱۲۳، ۱۲۴۔ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کی ممانعت سورۂ توبہ آیت ۱۱۳ میں آئی ہے۔

[۳] بعض روایات میں غسل اور کفن کا بھی ذکر ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ زیلعی، نصب الرایۃ: ۲/۲۸۱، ۲۸۲

[۴] ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب الرجل یموت لہ قرابۃ مشرک۔ نسائی، کتاب الطہارۃ، باب الغسل من مواراۃ المشرک۔ کتاب الجنائز، باب مواراۃ المشرک۔ مسند احمد: ۲/۱۳۶۔ حدیث نمبر ۸۰۷، ۱۰۷۴۔ تحقیق احمد محمد شاکر۔

اس کے اہلِ مذہب میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہو جو اسے دفن کرسکے تو میں اسے دفن کروں گا، اسے درندوں کو کھانے کے لیے نہیں چھوڑ دوں گا۔[۱]

فقہ حنبلی میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کسی کافر کا انتقال ہوجائے تو وہ اسے غسل نہیں دیں گے اور دفن نہیں کریں گے، چاہے وہ ان کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، الاّ یہ کہ اسے دفن کرنے والا کوئی نہ ہو۔ (اس صورت میں مسلمان اسے دفن کردیں گے) یہی امام مالک کی رائے ہے۔ لیکن ابوحفص عبکری کہتے ہیں کہ مسلمان کے لیے اپنے کافر قریبی رشتہ دار کو غسل دینا اور دفن کرنا جائز ہے۔ یہ رائے بھی امام احمد سے منقول ہے۔ امام شافعی کا مسلک یہی ہے۔[۲]

علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ ہمارے علماء (احناف) نے کہا ہے کہ کسی مسلمان کے کافر ماں باپ کا انتقال ہوجائے تو وہ انھیں غسل دے گا، جنازہ کا ساتھ دے گا اور دفن کرے گا، اس لیے کہ ان کے ساتھ معروف کے مطابق حسنِ سلوک کا جو حکم دیا گیا ہے یہ اس میں شامل ہے۔[۳]

ہدایہ میں قدوری کی عبارت ہے:

و اذا مات الکافر و له ولی مسلم فانه یغسله و یکفنه و یدفنه[۴]

کسی کافر کا انتقال ہوجائے اور مسلمان اس کا ولی ہو تو وہ اسے غسل دے گا اور اس کی تکفین اور تدفین کرے گا۔

---

۱ عبدالرزاق، مصنف: ۶/۴۲

۲ ابن قدامہ، المغنی: ۳/۴۶۶

۳ احکام القرآن: ۲/۲۳۶

۴ صاحب ہدایہ کا انداز سخت ہے۔ قدروی کی عبارت کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جیسے ناپاک کپڑا دھویا جاتا ہے اس طرح ناپاک سمجھ کر لاش پر پانی بہا دے گا۔ کفن اور دفن میں سنت کی رعایت نہ ہوگی، بلکہ چھوٹا سا گڑھا کھودا جائے گا، میت کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اس میں ڈال دیا جائے گا اور پھر مٹی سے ڈھک دیا جائے گا۔ ہدایہ: ۱/۱۶۱-۱۶۲۔ اس میں شک نہیں کہ غیر مسلم کی تدفین اسلامی شریعت کے مطابق نہیں ہوگی، لیکن مسلمان کسی بھی وجہ سے اس کی تدفین کر رہا ہو تو اس میں میت کے احترام کا پہلو ہمارے خیال میں بہرحال ملحوظ رہنا چاہیے۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ مسلمان کو کسی غیر مسلم رشتہ دار کی تجہیز و تکفین کرنی پڑے۔ اگر اس کے اہل مذہب اپنے طریقہ پر عمل کریں تو مسلمان اس میں اسی حد تک شریک ہوگا، جس حد تک شریعت اجازت دے۔

جنازہ میں شرکت

غیر مسلم سے خونی رشتہ یا اور کوئی قریبی تعلق ہو تو اس کے جنازہ میں شرکت کی بھی اجازت ہے۔

مشہور تابعی مکحول کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے جنازہ میں شرکت کی تھی۔ کنارے کنارے چلے، ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔ فرمایا: ''رشتہ نے آپ کو مجھ سے جوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔'' ان کی قبر پر آپ کھڑے نہیں ہوئے[۱]

امام شعبی کہتے ہیں کہ حارث بن ابی ربیعہ کی والدہ نصرانی تھیں۔ ان کا انتقال ہوا تو (بعض) صحابہ نے ان کے جنازہ کی مشایعت کی[۲]

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں:

ان کانت قرابة قریبة بین مسلم و کافر فلیتبع جنازته[۳] اگر قریبی رشتہ داری ہے مسلمان اور کافر کے درمیان تو مسلمان کو کافر کے جنازہ کے پیچھے چلنا چاہیے۔

غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت ہو تو اس بات کی احتیاط کرنی ہوگی کہ مسلمان کا امتیاز باقی رہے، انسانی تعلق اور ہمدردی کا اظہار بھی ہو اور یہ بات بھی واضح ہو کہ اسلام کے علاوہ کسی بھی دین کو وہ صحیح نہیں سمجھتا۔ اس کے لیے مختلف صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

ابو وائل کہتے ہیں کہ میری ماں کا انتقال ہوا۔ وہ نصرانیہ تھیں۔ میں نے حضرت

---

۱ مصنف عبد الرزاق: ۶/ ۳۸۔ حضرت علیؓ کی روایت گزر چکی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر ابوطالب کی تدفین کی تھی اور بعد میں اس کی اطلاع دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے آپ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ یہ روایت اس سے مختلف ہے۔

۲ مصنف عبد الرزق: ۶/ ۳۶ ۳ حوالہ سابق

عمرؓ سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا: جب اس کا جنازہ روانہ ہوتو تم سواری پر آگے آگے چلو۔

امام احمد بن حنبل اس کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ کسی یہودی یا نصرانی کا انتقال ہوجائے تو اس کی مسلمان اولاد سواری پر جنازہ کے آگے چلے اور دفن کے وقت واپس ہوجائے[۱]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ نصرانیہ تھی۔ کیا میں اس کی تدفین میں شریک ہوسکتا ہوں؟ انھوں نے جواب دیا کہ جنازہ کے آگے چلو، اس لیے کہ تم (دینی لحاظ سے) اس کے ساتھ نہیں ہو[۲]

قتادہ کہتے ہیں کہ مسلمان کافر کے جنازہ کے پیچھے چلے گا اور کنارے رہے گا، اس سے قریب نہیں ہوگا[۳]

غیر مسلم میت کے اہل مذہب موجود ہوں تو وہ اپنے طریقہ پر عمل کریں گے۔ یہ ان کا مذہبی حق ہے۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ مسلمان رشتہ دار صرف جنازہ میں شریک ہوگا۔

خالد بن عبد اللہ قسری کی ماں کا انتقال ہوا۔ وہ نصرانیہ تھیں۔ خالد نے دمشق کے پادریوں کو طلب کیا اور کہا کہ اس کی تجہیز وتکفین میں وہ طریقہ اختیار کرو جو بادشاہوں کی لڑکیوں کے لیے اختیار کرتے ہو، اس لیے کہ اس کا تعلق بھی بادشاہوں کی اولاد سے تھا۔ پھر گھر کی عورتوں نے پادریوں کی ہدایت کے مطابق انھیں غسل دیا اور تجہیز وتکفین کی۔ جنازہ جب چلا تو خالد اپنی سواری پر نکلے، نمایاں اشخاص بھی ساتھ تھے۔ کنارے کنارے چلتے رہے۔ قبر تک پہنچے تو اپنی سواری کا رُخ موڑا اور واپس ہوگئے۔ کہا: یہ ہماری ماں کے ساتھ آخری سلوک ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ

---

۱ ابن قدامہ، المغنی: ۳/۴۶۶

۲ مصنف عبد الرزاق: ۶/۳۷

۳ حوالہ سابق

شیخ عبد اللہ بن ابو زکریا نے اپنی ماں کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ان کا شمار شام کی نمایاں شخصیات میں ہوتا تھا۔ بڑے عابد و زاہد اور فقیہ تھے۔

مکحول (تابعی) کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بھی اسی پر عمل کرتے تھے[1]

جنازہ کے آگے یا پیچھے چلنا، درمیان میں یا کنارے چلنا، سواری پر یا پیدل چلنا، ان میں سے ہر ایک کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، البتہ ایسے کسی بھی موقع پر اپنے دینی تشخص اور انفرادیت کو کھو دینا صحیح نہیں ہے۔ اسے باقی رکھتے ہوئے آدمی حالات کے لحاظ سے خود فیصلہ کرسکتا ہے۔ اس سے بہرحال اتنی بات ثابت ہے کہ وقت ضرورت غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت ناروا نہیں ہے۔

غیر مسلم عزیز کی قبر کی زیارت

کافر ماں باپ یا قریبی عزیز کے انتقال کے بعد اگر ان کی یاد آجائے تو آدمی ان کی قبر پر بھی جاسکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی والدہ (حضرت آمنہ) کی قبر کی زیارت فرمائی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ جو صحابہ کرام ساتھ تھے وہ بھی رو پڑے۔ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کے لیے استغفار کی اجازت مانگی، لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں ملی۔ میں نے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت طلب کی تو اجازت دے دی گئی۔ تم لوگ قبروں کی زیارت کرو۔ اس سے موت کی یاد تازہ ہوتی ہے[2]

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں:

فیه جواز زیارة المشرکین فی الحیوٰة و قبورهم بعد الوفاة اس سے مشرکین کی ان کی زندگی میں زیارت اور ملاقات اور مرنے کے بعد ان کی قبور کی

---

[1] مصنف عبد الرزاق: ۶/ ۳۷، ۳۸

[2] مسلم، کتاب الجنائز، باب استئذان النبیؐ ربہ فی زیارة قبر امہ۔ ابو داؤد، کتاب الجنائز، باب فی زیارة القبور۔

جازت زیارتھم بعد الوفاۃ ففی الحیوۃ اولیٰ۔[1] زیارت کا جواز نکلتا ہے، اس لیے کہ جب ان کی زیارت ان کی وفات کے بعد جائز ہے تو زندگی میں بدرجہ اولیٰ جائز ہونی چاہیے۔

غیر مسلم کی تعزیت

کسی کے عزیز و قریب کا انتقال ہوتو اس کا یہ حق ہے کہ اس کی تعزیت کی جائے اور اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ہو۔ جس طرح مسلمان کی تعزیت کی جاتی ہے، غیر مسلم کی بھی تعزیت کی جانی چاہیے۔ یہ ایک سماجی تقاضا بھی ہے اور اسلام کی تعلیم کے عین مطابق بھی۔ البتہ اس موقعے پر کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکلنی چاہیے جو ایک مسلمان کے عقیدہ کے خلاف ہو۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے دریافت کیا کہ یہودی یا نصرانی کی اولاد یا قرابت دار کا انتقال ہوجائے تو کیسے تعزیت کی جائے؟ فرمایا: اس طرح کہے:

''اللہ تعالیٰ نے موت اپنی ہر مخلوق کے لیے لکھ دی ہے (اس سے کسی کو رستگاری نہیں) ہماری دعا ہے کہ موت، جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، جب آئے تو خیر کے ساتھ آئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ جو مصیبت آئی ہے اس پر صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری تعداد نہ گھٹائے (تمھاری نسل میں کمی نہ ہو)۔''[2]

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ کے پاس ایک نصرانی آتا اور آپ کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس کے بھائی سے تعزیت کی۔ فرمایا: تم پر جو مصیبت آئی ہے، اللہ تعالیٰ تمھیں اس کا وہ ثواب عطا کرے جو تمہارے ہم مذہب لوگوں کو عطا کرتا ہے۔ موت کو ہم سب کے لیے برکت کا باعث

---

[1] نووی، شرح مسلم: ج ۳، جزء ۴۵

[2] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۲۱۶

بنائے اور وہ موجبِ خیر ہو جس کا ہم انتظار کریں۔ جو مصیبت آئی ہے اس پر صبر کا دامن نہ چھوڑو۔[۱]

اس طرح تعزیت کا نہ صرف یہ کہ جواز ہے، بلکہ کہا گیا ہے کہ کسی یہودی یا مجوسی کے بچہ کا انتقال ہو جائے تو اس کے مسلمان پڑوسی کو اس کی تعزیت کرنی چاہیے اور کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہت اچھا جانشین عطا فرمائے اور آپ کے حالات کو بہتر بنائے۔[۲]

یہ ہے اس رویہ کی ایک جھلک جسے غیر مسلموں کے سلسلے میں اپنانے کی قرآن و حدیث نے تعلیم دی ہے اور جس کی قانونی اور اخلاقی حیثیت سے ہمارے علماء و فقہاء نے بحث کی ہے۔

---

۱ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۲۱۷۔ اس طرح کے مناسب الفاظ بعض اور اصحاب سے بھی منقول ہیں۔ ملاحظہ ہو: ابن قدامہ، المغنی: ۳/۴۸۶، ۴۸۷

۲ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۵/۳۴۱

ازدواجی تعلقات

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں اور مسلمانوں کے تعلقات کو بہتر اور مضبوط بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے درمیان شادی بیاہ کے رشتے قائم ہوں، تاکہ آپس میں جو تہذیبی دوری اور بیگانگی ہے وہ ختم ہو اور وہ ایک دوسرے کے کلچر اور تہذیب سے قریب ہوں اور اسے اختیار کرسکیں۔ اسلام اس اندازِ فکر کا مخالف ہے۔ اس کے نزدیک جن مذاہب کے عقائد اور نظریات میں بنیادی اختلاف ہے ان کے ماننے والوں کا ازدواجی رشتوں میں منسلک ہونا صحیح نہیں ہے۔ ان رشتوں کو اس نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔

اسلام کے اس موقف پر ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور ہمدردی کی تعلیم دی ہے، ان کے ساتھ معاشی اور سماجی تعلقات کو جائز قرار دیا ہے، مختلف امور و مسائل میں ان سے تعاون کو روا رکھا ہے تو پھر شادی بیاہ کے معاملے میں اس سخت رویہ کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ کیا یہ اس کی مجموعی تعلیمات متضاد طرزِ عمل نہیں ہے؟ کیا اس سے تعصب، عناد اور دوری نہ پیدا ہوگی؟

اب یہ ہے کہ یہ محض خام خیالی ہے کہ بین الملّی یا بین المذاہب ذریعہ ہیں۔ اس طرح کے سطحی اقدامات سے قربت نہیں پیدا ں بنیاد کی ضرورت ہے۔ اگر جذبات سے ہٹ کر غور کیا جائے تو

محسوس ہوگا کہ اسلام کا موقف معقول اور مدلل بھی ہے اور عملی بھی۔ اسے سمجھنے کے لیے بعض بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ازدواجی زندگی میں عورت اور مرد کے درمیان الفت و محبت کی فضا کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ فضا وقتی اور ہنگامی طور پر نہیں، بلکہ مستقل اور پائیدار ہونی چاہیے، تاکہ وہ مل جل کر گھر اور خاندان کی بہتر تعمیر کرسکیں اور اسے صحیح رخ دے سکیں۔

بعض اوقات کسی ہنگامی محرک، وقتی جوش یا جنسی جذبہ کے تحت ازدواجی رشتہ قائم ہو جاتا ہے، لیکن اس میں استحکام اور پائیداری نہیں ہوتی۔ اس طرح کے رشتے بالعموم تلخی اور ناکامی پر ختم ہوجاتے ہیں۔ مغرب اس بھیانک تجربہ سے گزر رہا ہے۔ خوش گوار ازدواجی زندگی اسی وقت ممکن ہے جب کہ میاں بیوی کے مابین محبت کا مضبوط رشتہ پایا جائے اور اسے کم زور کرنے والے عوامل اور نزاع و اختلاف کو ابھارنے والے اسباب نہ پائے جائیں، ورنہ دونوں کی زندگی نفسیاتی اور عملی الجھنوں کا شکار ہوگی اور وہ یکسوئی کے ساتھ ازدواجی زندگی کے مقاصد پورے نہ کرسکیں گے۔ دین و مذہب اور عقیدہ کا اختلاف بنیادی اختلاف ہے، جو زندگی کا رخ متعین کرتا ہے۔ اس اختلاف کو میاں بیوی کا نازک رشتہ زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکتا۔ دیر سویر یہ ٹوٹے گا اور اس کے ٹوٹنے سے خاندان کا پورا شیرازہ بکھر جائے گا۔ یہ کوئی معمولی نقصان نہیں، بلکہ بہت بڑا نقصان ہے، جو پورے معاشرہ کو اٹھانا پڑے گا۔

بعض ایسی مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں جن میں میاں بیوی نے مذہبی اختلاف کے باوجود خوش گوار زندگی گزاری اور ان کے تعلقات میں کوئی خرابی نہیں دیکھی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ رشتے ہیں، جن میں طرفین میں سے کسی کا کوئی عقیدہ اور مذہب نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی حیثیت ایک بے جان روایت کی ہوتی ہے۔ اس سے عملاً انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ جب طرفین کا ذہن مذہب اور اس کے تقاضوں سے خالی ہو تو اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ جس کا کوئی

عقیدہ و مذہب ہے اور اس کی صحت و صداقت پر وہ مطمئن ہے تو اس کی فطری خواہش ہوگی اور ہونی چاہیے کہ اس کا شریک حیات بھی اسی عقیدہ اور فکر کا حامل ہو۔ فریقین میں عقیدہ کا اختلاف خاندانی زندگی کو سکون سے محروم کرسکتا ہے۔

آیئے، اس مسئلہ پر خالص اسلامی نقطۂ نظر سے بھی غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس سے کیا الجھنیں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے لیے اس کے مجموعی مزاج اور اس کے اخلاقی اور قانونی تقاضوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اسی سے اس کا موقف سمجھا جاسکتا ہے۔

اسلام خاص قسم کی معاشرت وجود میں لانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے طہارت اور پاکی صفائی، غذا، لباس اور وضع قطع سے متعلق تفصیلی احکام دیے ہیں۔ بعض چیزیں اس کے نزدیک حلال اور طیب ہیں تو بعض چیزیں حرام اور ناپاک ہیں، رشتہ داروں کے درمیان اس نے محرم اور نامحرم اور قریب اور دور کا فرق رکھا ہے اور اسی بنیاد پر ان سے شادی بیاہ، حجاب اور عدم حجاب کے احکام بیان کیے ہیں۔ اسی طرح پیدائش سے لے کر موت تک خوشی اور غم کے تمام مواقع کے لیے اس کی ہدایات ہیں۔ ان سب کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ خاندانی زندگی سے ہے۔ یہ قدم قدم پر عورت اور مرد کے باہم تعاون کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کے بغیر وہ تہذیب اور معاشرت وجود میں نہیں آسکتی جو اسلام کو مطلوب ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس تعاون کے بغیر اسلام کے بنیادی تقاضے پورے نہیں ہوسکتے اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسی عبادات کی بھی، جو پورے دین کی بنیاد ہیں، پابندی ممکن نہیں ہے۔ ایمان اور عقیدہ کے اختلاف کے ساتھ اس راہ میں بھرپور تعاون کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اسلام چاہتا ہے کہ ازدواجی تعلق کے نتیجہ میں جو اولاد ہو وہ 'ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً' ہو اور ایک نسل سے دوسری نسل تک خدا کا دین، اس سے محبت اور تعلق اور اس کی عبادت و اطاعت کا جذبہ منتقل ہوتا رہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ والدین کے قلوب روحِ ایمان

سے سرشار ہوں، ان کی شب و روز کی زندگی نیکی اور تقویٰ اور خدا ترسی کی زندگی ہو اور وہ شعوری طور پر اس بات کی کوشش کریں کہ اولاد کے اندر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو اور پروان چڑھے، دینی حمیت سے اس کا سینہ سرشار ہو اور وہ دین کو اپنے لیے سب سے بڑا سرمایہ سمجھنے لگے اور کسی حال میں اس سے دست بردار ہونے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ یہ چیز ماں باپ کی مشترکہ اور مسلسل جدوجہد چاہتی ہے۔ اختلافِ دین کے ساتھ یہ مہم انجام نہیں پاسکتی۔ ماں باپ کی زندگی اولاد کے لیے نمونہ ہوتی ہے۔ یہ نمونہ بہتر اسی وقت ہوتا ہے جب کہ دونوں کا سمتِ سفر صحیح بھی ہو اور وہ اسی پر گام زن بھی رہیں۔ ماں باپ اگر بے دین یا دین سے بے تعلق ہوں تو اولاد دین دار بن کر نہیں ابھر سکتی۔

اسلام جس ازدواجی تعلق کو صحیح نہیں تسلیم کرتا اس کی بنیاد پر حقوق اور ذمہ داریوں کا سوال بھی اس کے نزدیک بے معنی ہے۔ جب کوئی عورت اسلامی قانون کی رو سے کسی کی بیوی اور وہ اس کا شوہر نہیں ہے تو دونوں کے حقوق اور ذمہ داریاں از خود ختم ہوجاتی ہیں۔ عورت نہ تو اپنے حقوق کا مطالبہ کرسکتی ہے اور نہ مرد کے مطالبات کی تعمیل اس کے لیے لازمی ہوگی۔ اس تعلق کے نتیجہ میں جو اولاد ہوگی وہ بھی اپنے نان ونفقہ، تعلیم وتربیت جیسے قانونی حقوق سے محروم ہوگی، ان کے درمیان قانونِ وراثت نافذ نہیں ہوگا۔ اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ اس ناجائز تعلق پر عورت اور مرد دونوں پر اسلامی ریاست میں حدِ شرعی نافذ ہوگی۔

اہلِ شرک سے ازدواجی تعلقات کی ممانعت

مشرکین سے ازدواجی تعلقات کے بارے میں قرآن مجید نے صریح الفاظ میں ممانعت کی ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو جب تک کہ

وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلاَ تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْ اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ○

(البقرۃ:۲۲۱)

وہ ایمان نہ لے آئیں۔ مومن لونڈی (آزاد) مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو اچھی لگے اور مشرکین جب تک ایمان نہ لے آئیں ان سے اپنی عورتوں کا نکاح مت کرو اور مومن غلام (آزاد) مشرک سے بہتر ہے چاہے وہ تمھیں پسند ہی کیوں نہ آئے۔ یہ لوگ نارِ جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے جنت اور مغفرت کی دعوت دیتا ہے اور اپنے احکام کھول کھول کر لوگوں کو بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو مشرک عورتوں سے نکاح کرنے سے اور مسلمان عورتوں کو مشرکین کے نکاح میں دینے سے صاف منع کیا گیا ہے کہ کوئی مشرکہ اگر حسین و جمیل، صاحب ثروت و راعلیٰ حسب ونسب والی ہے تو بھی اس کے مقابلہ میں ایک مسلمان باندی بہتر ہے، خواہ اسے ان میں سے بیش تر چیزیں حاصل نہ ہوں۔ اسی طرح ایک مشرک کے مقابلہ میں مسلمان غلام اچھا ہے، چاہے مادی لحاظ سے وہ مشرک سے کم تر ہی کیوں نہ ہو۔

آیت کے آخر میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مناکحت کے عدم جواز کی وجہ بیان کردی گئی ہے۔ وہ یہ کہ شرک اور توحید دو متضاد تصورات ہیں۔ دونوں کی راہیں جدا ہیں۔ مشرکین دینِ شرک کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہیں، اسلام توحید کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک شرک کا راستہ تباہی کا راستہ ہے جو جہنم تک انسان کو پہنچاتا ہے اور اسلام سے دنیا اور آخرت کی کامیابی وابستہ ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان جہاں عقیدہ کا یہ زبردست فرق پایا جائے وہاں ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ میاں بیوی میں سے ایک کی زندگی مشرکانہ تصورات پر مبنی ہو اور دوسرا توحید کی راہ پر چلنا چاہے تو قدم قدم پر تصادم ہوگا اور گھر کا نظم اور سکون باقی نہیں رہ سکے گا۔

صلح حدیبیہ ذی قعدہ ۶ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد سورۂ ممتحنہ ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی۔ اس میں کہا گیا کہ مکہ میں جو مسلمان عورتیں کفار کے نکاح میں ہیں وہ وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ آجائیں تو انھیں دوبارہ مکہ نہ بھیجو، اس لیے کہ ان کے ازدواجی رشتے ختم ہوگئے ہیں[1]

ارشاد ہے:

لاَ هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلاَ هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (الممتحنۃ:۱۰) یہ مسلمان عورتیں نہ ان کافروں کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ کافر مردان مسلمان عورتوں کے لیے۔

اس فقرہ کے تحت حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

هٰذه الْاٰية هی التی حرمت المسلمات علی المشرکین و قد کان جائزا فی ابتداء الاسلام ان یتزوج المشرک المؤمنة[2] یہی آیت ہے، جس نے مسلمان عورتوں کے مشرکین سے نکاح کو حرام قرار دیا۔ آغاز اسلام میں مشرک کا مومنہ سے شادی کرنا جائز تھا۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں: لاَ هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ یہ جملہ اسمیہ ہے۔ عربی قواعد کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ جدائی ثابت ہے اور جو نکاح ہوچکے ہیں وہ ختم ہوگئے۔ وَلاَ هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ جملہ فعلیہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مستقبل میں بھی ان سے نکاح جائز نہیں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تکرارِ حرمت اور قطع تعلق پر زور دینے اور اسے مؤکد کرنے کے لیے ہو[3]

اسی آیت میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ مسلمان اپنی کافر بیویوں کو (جو مکہ میں رہ

---

[1] اس آیت کا ایک خاص پس منظر ہے اور اس سے متعلق بعض قانونی مباحث ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ: 'تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث' کا مضمون 'غیر مسلموں سے ازدواجی تعلقات' ص:۱۰۷ تا ۱۳۶۔

[2] ابن کثیر، تفسیر: ۴/۳۵۱

[3] آلوسی، روح المعانی، جزء ۲۸، ص ۷۶

رہی تھیں) چھوڑ دیں:

وَ لاَ تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ — کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں مت روکے رکھو۔

(الممتحنۃ:۱۰)

امام نخعی اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

و كان الكفار يتزوجون المسلمات والمسلمون يتزوجون المشركات ثم نسخ ذلك فى هٰذه الْاٰية[1] — کفار مسلمان عورتوں سے اور مسلمان مشرک عورتوں سے نکاح کرتے تھے۔ اس آیت میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔

علامہ ابن جریر طبری آیت کے اس فقرہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

هٰذا نهى من اللّٰه للمؤمنين عن الْاقدام علٰى نكاح النساء المشركات من اهل الاوثان وا مر لهن بفراقهن.[2] — اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو مشرک عورتوں سے، جو بت پرست ہیں، نکاح کا اقدام کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ان کو چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

دورِ صحابہ میں اس پر عمل درآمد کی مثالیں

اس حکم پر جس طرح عمل ہوا اس کا ذکر امام زہری ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فطلق المومنون حين انزلت هٰذه الْاٰية كل امرأة كافرة كانت تحت رجل منهم[3] — جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے ہر اس کافر عورت کو، جو ان میں سے کسی کے عقد میں تھی، طلاق دے دی۔

اس حکم کے آنے کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنی دو مشرک بیویوں کو، جو مکہ ہی

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۸/ ۶۵

[2] ابن جریر طبری، تفسیر: جزء ۲۸ ص ۴۷

[3] حوالہ سابق

میں مقیم تھیں، طلاق دے دی۔ ان میں سے ایک قریبہ بنت ابو امیہ تھی، جس کا نکاح حضرت معاویہؓ سے ہوا، جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ دوسری ام کلثوم بنت عمرو بن جرول الخزاعی تھی، جس سے اسی کے خاندان کے ایک شخص ابوجہم بن حذیفہ بن غانم نے شادی کر لی۔[۱]

حضرت عیاض بن غنمؓ نے اپنی بیوی ام الحکم بنت ابوسفیان کو طلاق دی۔ ان سے عبد اللہ بن عثمان ثقفی نے شادی کر لی۔[۲]

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ نے اروٰی بنت ربیعہ کو طلاق دی۔ بعد میں یہ اسلام لائیں اور ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص سے ان کا نکاح ہوا۔[۳]

جو مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور جن کے شوہر کافر تھے، ان سے ان کا ازدواجی رشتہ ختم ہوگیا:

سبیعہ بنت الحارث الاسلمیہؓ: روایات میں آتا ہے کہ حدیبیہ میں معاہدۂ صلح کی کتابت جیسے ہی مکمل ہوئی وہ خدمت میں پہنچیں تو ان کے شوہر بھی، جن کا نام مسافر مخزومی یا صیفی بن الراہب تھا، پہنچ گئے اور کہا کہ میری بیوی کو واپس بھیجئے، اس لیے کہ معاہدہ کی شرائط میں یہ داخل ہے اور ابھی کتابت کی روشنائی خشک بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے بعد سورۂ ممتحنہ کی آیت نازل ہوئی اور بقول زمخشری معاہدہ میں جو اجمال تھا اسے اس نے کھول دیا۔ آپ نے انھیں واپس نہیں بھیجا۔ مدینہ میں ان کی شادی حضرت عمرؓ

---

۱ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۳/ ۳۷۷، طبری، تاریخ الرسل والملوک: ۲/ ۶۴۔ اس سلسلہ کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ فتح الباری: ۹/ ۹

۲ بخاری، کتاب الطلاق، باب نکاح من اسلم من المشرکات وعدتہن۔ ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، علی ہامش الاصابۃ لابن حجر: ۴/ ۴۴۵

۳ ابن حجر، فتح الباری: ۹/ ۴۱۹۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۸/ ۶۶

سے ہوئی[۱]

امیمہ بنت بشرؓ: اسلام لانے کے بعد یہ اپنے کافر شوہر حسان بن دحداح اور طبری کی روایت کے مطابق ثابت بن دحداح سے فرار ہوکر مدینہ پہنچیں تو رسول اللہ ﷺ نے اس رشتہ کو ختم کر کے سہل بن حنیف سے ان کا نکاح کر دیا، جن سے ان کے صاحب زادے عبد اللہ بن سہل ہیں۔ روایت میں ہے کہ سورۂ ممتحنہ کی آیت ان کے سلسلے میں نازل ہوئی[۲]

اس طرح کی بعض اور خواتین کا بھی ذکر ملتا ہے، لیکن ان سے متعلق تفصیلات میں اختلاف ہے، اس لیے یہاں ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے[۳]

کتابیات سے نکاح کا جواز[۴]

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ کے معاملہ میں تمام مذاہب کو ایک صف میں رکھا ہے یا ان میں فرق کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام اس معاملہ میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کے درمیان فرق کرتا ہے۔ چناں چہ جہاں اس نے مشرکین سے ازدواجی تعلقات رکھنے سے منع کیا ہے وہیں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کو

---

۱ زمخشری، الکشاف: ۴/ ۹۳۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۸/ ۶۱۔ ابن حجر، فتح الباری: ۵/ ۳۴۸۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/ ۳۲۵

۲ طبری، تفسیر، جزء ۲۸، ص ۴۴۔ ابن حجر، فتح الباری: ۵/ ۳۴۸۔ علامہ ابن اثیر اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ امیمہ بنت بشر کا تعلق انصار کے خاندان بنو عمرو بن عوف سے تھا اور آیت مہاجرین کے سلسلے میں نازل ہوئی۔ اسد الغابہ: ۷/ ۲۵۔ حافظ ابن حجر نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہوسکتا ہے، امیمہ بنت بشر کے شوہر انصار سے متعلق نہ ہوں، وہ ان کو مکہ منتقل کر کے لے گئے ہوں اور پھر وہ وہاں سے مدینہ آئی ہوں۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/ ۲۳۹

۳ ابن حجر، فتح الباری: ۵/ ۳۴۸

۴ کتابیات سے نکاح کے مسئلہ پر راقم نے اپنے مقالہ 'غیر مسلموں سے ازدواجی تعلقات' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو: 'تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث'۔ یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

جائز قرار دیا ہے۔ چناں چہ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

..... وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ○ (المائدۃ:۵)

(تمھارے لیے حلال ہیں) اہلِ ایمان میں کی پاک دامن[1] عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب کہ تم انھیں ان کے مہر ادا کرو، انھیں قید نکاح میں لاؤ، بدکاری نہ کرو اور چوری چھپے دوستی نہ کرو (یاد رکھو) جو شخص ایمان کا انکار کردے اس کا عمل رائیگاں گیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والا ہوگا۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان جس طرح شریف مسلمان عورت سے نکاح کرسکتا ہے اسی طرح شریف کتابیہ سے بھی نکاح کرنا اس کے لیے جائز ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان عقائد کا بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے، وہ خدا کو مانتے ہیں، اصولاً توحید کے بھی قائل ہیں، وحی و رسالت کو تسلیم کرتے ہیں، آخرت اور وہاں کی جزا و سزا کا بھی تصور رکھتے ہیں۔ ان کے عقائد میں انحراف بھی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی کوئی عورت کسی مسلمان کے حبالۂ عقد میں آئے تو دونوں اس طرح کی دوری نہیں محسوس کریں گے جس طرح کی دوری کسی مشرک عورت سے مسلمان کے نکاح کی صورت میں پائی جاسکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اہل کتاب مشرکین کے زمرے میں نہیں آتے؟ کیا ان کے اندر کسی نہ کسی نوعیت کا شرک نہیں پایا جاتا، یا یہ کہ وہ ہر طرح کے شرک سے پاک ہیں؟ اگر ان میں بھی شرک ہے تو پھر سورۂ مائدہ کے حکم کی نوعیت کیا ہے؟

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پہلے سورۂ بقرہ میں مشرکات سے نکاح کی ممانعت کی گئی، پھر سورۂ مائدہ کی آیت کے ذریعہ اہل کتاب کو اس سے مستثنیٰ

[1] محصنات کا ترجمہ بالعموم پاک دامن عورتیں کیا گیا ہے۔ اس کے معنی آزاد عورتوں کے بھی لیے گئے ہیں۔

کیا گیا[1]

یہی بات متعدد تابعین نے کہی ہے۔ علاّمہ ابن جریر طبری ان آراء کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ سورہ بقرہ میں جن مشرکات کا ذکر ہے اس میں اہل کتاب کی عورتیں نہیں آتیں۔ ان سے نکاح کو اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہے۔ یہی حضرت قتادہؒ سے منقول ہے اور اسی کو ترجیح حاصل ہے[2]

قرآن مجید نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ کوئی مسلمان عورت اہل کتاب میں سے کسی کے عقد میں چلی جائے۔ یہ ہر حال میں ناجائز ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مرفوع حدیث بھی حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نتزوج نساء اهل الكتاب ولاَ يتزوجون نساءنا[3] ہم اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کریں گے، لیکن ہماری عورتوں سے نکاح کی انھیں اجازت نہ ہوگی۔

ان دلائل کی بنا پر جمہور کے نزدیک کتابیہ سے نکاح جائز ہے، بلکہ بعض اصحابِ علم نے تو لکھا ہے کہ اس کے جواز پر امت کا اجماع ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کا شکر ہے کہ اہل علم کے درمیان اہل کتاب کی آزاد عورتوں سے نکاح کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جن اصحاب سے اس کا جواز منقول ہے ان میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت سلمانؓ اور حضرت جابرؓ وغیرہ شامل ہیں۔ علامہ ابن المنذر فرماتے ہیں کہ امت کے ابتدائی دور

---

[1] طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۴/ ۳۶۲

[2] حوالہ سابق، ص ۳۶۵

[3] اس حدیث میں کسی قدر ضعف ہے، لیکن قابل احتجاج ہے۔ طبری، جامع البیان: ۴/ ۳۶۷، حاشیہ ۳

کے اصحاب میں سے کسی سے بھی اس کی حرمت منقول نہیں ہے۔ خلال کی روایت ہے کہ حضرت حذیفہؓ، حضرت طلحہؓ، جارود بن المعلّٰی اور اذینۃ العبدی نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کیا ہے۔ یہی بات تمام اہل علم نے کہی ہے۔ البتہ شیعہ میں فرقہ امامیہ نے اسے حرام قرار دیا ہے اور سورۂ بقرہ اور سورۂ ممتحنہ کی آیات سے اس پر استدلال کیا ہے[1]

صحابہ کرام میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، اس لیے کہ ان کے نزدیک وہ بھی مشرکین میں شامل ہیں۔ چناں چہ جب ان سے یہودیہ یا نصرانیہ سے نکاح کے متعلق دریافت کیا جاتا تو جواب دیتے:

ان اللّٰہ حرّم المشرکات علی المؤمنین ولاَ اعلم من الاُشراک شیئا اکبر من ان تقول المرأۃ ربھا عیسٰی وھو عبد من عباد اللّٰہ[2]

اللہ تعالیٰ نے مشرکات کو مومنین کے لیے حرام ٹھہرایا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑا شرک کوئی اور ہوسکتا ہے کہ عورت کہے کہ عیسیٰؑ اس کے رب ہیں۔ حالاں کہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک ہیں۔

احتیاط پسندیدہ ہے

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیات سے نکاح پر حضرت عمرؓ نے سخت برہمی کا اظہار کیا۔ چناں چہ مشہور تابعی حضرت شقیق کی (صحیح سند کے ساتھ) روایت ہے کہ

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۹/ ۵۴۵

[2] بخاری، کتاب الطلاق، باب قول اللہ ولاَ تنکحوا المشرکات۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے علاوہ تابعین میں محمد بن الحنفیہ اور شیعوں میں فرقہ زیدیہ کے امام ہادی نے بھی کتابیات سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ رازی، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)۔ اس رائے کی کم زوری کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مذکورہ بالا مضمون 'غیر مسلموں سے ازدواجی تعلقات'۔

حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودیہ سے شادی کی تو حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اسے وہ طلاق دے دیں۔ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ اسے حرام سمجھتے ہیں تو بتائیں، میں اسے چھوڑ دوں۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا:

لاَ اَزْعم انها حرام و لٰكن اخاف ان میں نہیں کہتا کہ وہ حرام ہے، لیکن مجھے ڈر ہے کہ

تعاطوا المومسات منهن[1] تم ان کی بدکار عورتوں سے نکاح نہ کرنے لگو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اس بات کے تو قائل تھے کہ کتابیات سے نکاح جائز ہے، لیکن انھیں اندیشہ تھا کہ اس پر عمل ہو تو ان کی صالح عورتیں ہی نہیں، ان کی غلط کار عورتیں بھی مسلمانوں کے گھروں میں پہنچنے لگیں گی۔ اس اندیشہ کی بنیادیں غالباً دو تھیں: ایک یہ کہ اس وقت یہود و نصاریٰ انتہائی اخلاقی گراوٹ میں مبتلا تھے۔ اس حالت میں ان سے ازدواجی رشتے مسلمانوں کے اخلاقی زوال کا سبب بن سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید نے عفیف اور پاک دامن عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ حضرت عمرؓ شاید یہ محسوس فرما رہے تھے کہ اس کی معلومات کا کوئی اطمینان بخش ذریعہ نہیں ہے۔ بہر حال حضرت عمرؓ کے بارے میں یہی بات صحیح ہے کہ وہ اصولاً کتابیات سے نکاح کے جواز کے قائل تھے، لیکن مسلم معاشرہ میں اس کے رواج کو ناپسند فرماتے تھے۔

---

[1] طبری، جامع البیان: ۴/ ۳۶۶، ۳۶۷۔ نیز ملاحظہ ہو قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۳/ ۶۸